النظام السياسي غير المشروع: بين الإنشاء والمشاركة:

غیر شرعی نظام کو بنانے اور اسکے اندر شرکت کرنے میں فرق ہے

شیخ ابراہیم السکران (ماجستر السیاسۃ الشرعیۃ از جامعۃ الامام)
اردو استفادہ: حامد کمال الدین

جہاں تک تو ہے ایک خالص شرعی سیاسی نظام کا تعلق، تو اس کو وجود میں لانا بھی جائز ہے اور اس میں شرکت کرنا بھی۔ نہ صرف جائز بلکہ یہ امت پر واجب ہے، کیونکہ یہ دینِ خداوندی کی اقامت کو مکمل کرنے کا حصہ ہے۔

اور جہاں تک ہے ایک خلافِ شریعت نظام کا تعلق جیسے: استبداد، آمریت یعنی تغلُّب، ہرقلیت یعنی موروثی بادشاہت، ملکِ جبری، ملکِ عضوض وغیرہ، یا مثلاً انسان ساختہ سیاسی نظام جو خلافِ شریعت ہیں جیسے جمہوریت... تو اِن سب نظاموں کے معاملہ میں ان دو باتوں کا فرق کیا جاتا ہے:

1. ایک ہے "مقامِ انشاء"۔ یعنی اِن نظاموں کو وجود میں لانا،
2. اور ایک ہے "مقامِ مشارکہ للمصلحة الراجحة"۔ یعنی کسی مصلحت کو راجح پاتے ہوئے اس میں خالی شرکت کر لینا۔

دوسرے معنوں میں، اہل علم کے ہاں ان دو باتوں میں فرق کیا جاتا ہے:

1. ایک ہے مقامِ اختیار۔ یعنی جہاں ایک معاملے میں مرضی ہی آپ کی چلتی ہے۔
2. اور ایک ہے مقامِ اضطرار۔ یعنی جہاں آپ کی مرضی چلتی ہی نہیں ہے۔

اہل علم اس معاملہ میں ان دونوں احوال کا فرق کرتے ہیں: ایک وہ جب آپ کو ایک معاملہ میں قدرت حاصل ہے۔ دوسرا وہ جب آپ عاجز اور بے اختیار ہوتے ہیں۔

چنانچہ یہ سب نظام جو خلافِ شریعت ہیں، ان کو ابتداء سے وجود میں لانا تو جائز نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ وجود میں آئے ہوئے ہیں اور مستحکم حالت میں موجود پائے جاتے ہیں تو اس صورت میں البتہ کسی مصلحت کو راجح پاتے ہوئے ان کے اندر شرکت کرنا جائز ہے، تاکہ شریعت کا

فرض کردہ عدل جہاں تک ہو سکے قائم کیا جا سکے اور ظلم کو جہاں تک ہو سکے کم کیا جا سکے، خواہ یہ (خلافِ شریعت) حکومت استبدادی ہو اور خواہ ڈیموکریٹک۔

اگر پوچھا جائے کہ... دلیل کیا ہے ایک نظام کو ابتداء سے وجود میں لانے اور ایک پہلے سے پائے گئے نظام میں شرکت کرنے کے مابین فرق کرنے پر؟

اس قاعدہ پر دلیل نصوصِ شریعت کے وہ عمومات ہیں جو ایک بات کا مکلف ہونے کو وسعت، استطاعت، قدرت اور امکان سے مشروط کرتے ہیں، مثلاً سورۃ البقرۃ کے اختتام پر فرمانِ خداوندی: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا "اللہ نہیں بوجھ ڈالتا کسی نفس پر مگر اس کی وسعت کے اندر اندر"۔ اور یہ آیت فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ "اللہ کی حدوں کی پابندی کرو جتنی تمہاری طاقت ہے"۔ چنانچہ جس وقت مسلمان کی وسعت اور استطاعت ہے اُس وقت اُس کے لیے جائز نہیں کہ وہ ایک ایسا نظام قائم کرے جو شریعت کے مطابق نہیں۔ البتہ جس وقت وہ اختیار اور استطاعت کا مالک نہیں اُس وقت اُس کے لیے جائز ہے کہ وہ ایک ایسے خلافِ شریعت نظام میں جو پہلے سے چلا آتا ہے شرکت کر کے جتنا سا عدل قائم کر سکتا ہو یا جتنا سا ظلم کم کر سکتا ہو، کر لے۔

چنانچہ وسعت اور استطاعت سے متعلقہ نصوصِ شریعت اِس مسئلہ کی عمومی بنیادیں ہیں، اور اصل تو یہی ہیں۔ البتہ ان عمومی بنیادوں کے ساتھ کچھ ایسی بنیادیں بھی ہیں جو دلیلِ خاص کا فائدہ دیتی ہیں، جن میں سے چند ایک:

عزیزِ مصر کا عہدہ: عزیزِ مصر کی حکومت وثنی حکومت تھی، جیسا کہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

العزيز وامرأته وأهل مصر كانوا مشركين كما قال لهم يوسف: "إِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لاَّ يُؤْمِنُونَ بِاللّهِ وَهُم بِالآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ ، وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَآئِي إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ مَا كَانَ لَنَا أَن نُّشْرِكَ بِاللّهِ مِن شَيْءٍ" (جامع الرسائل ج 2 ص 262)

عزیز مصر، اس کی بیوی اور اہل مصر مشرک تھے، جیسا کہ یوسف علیہ السلام نے ان کو کہا تھا: "میں تارک ہوا ان لوگوں کی ملت کا جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور جو آخرت کے کافر ہیں۔ اور میں پیرو ہوا اپنے آباء کی ملت کا، یعنی ابراہیم، اسحاق اور یعقوب۔ ہمارا کام نہیں کہ ہم اللہ کے ساتھ شرک کریں کچھ بھی۔

لیکن اس کے باوجود، یعنی اس حکومت کے بت پرستانہ ہونے کے علی الرغم، یوسف علیہ السلام نے سیاسی طور پر اس میں کردار ادا کرنے کی طلب کی۔ اور خصوصی طور پر مالیات کا شعبہ طلب

فرمایا اور بادشاہ کو اپنی اُن خصوصی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب دی جو ریاست کے وسائل کو قابو میں لانے کے ساتھ خصوصی مناسبت رکھتی تھیں:

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِي فَلَمَّا كَلَّمَهُ قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ * قَالَ اجْعَلْنِي عَلَى خَزَائِنِ الْأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ * وَكَذَلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ يَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ

اور بادشاہ نے کہا: اس کو میرے پاس لاؤ، میں اس کو اپنا خصوصی آدمی بناؤں، پھر جب اُن کی بات چیت ہوئی تو اُس نے کہا: آج سے تو ہمارے ہاں معزز اور معتبر ہے۔ اُس نے کہا: مجھے زمین کے خزانوں پر مقرر کر دو، بے شک میں حفاظت والا مہارت والا ہوں۔ اور اس طرح ہم نے یوسف کو زمین میں طاقت بخشی کہ اس میں وہ جہاں چاہے رہے۔

چنانچہ یہاں غور فرمایئے: مشرکوں کی ایک حکومت میں یوسف علیہ السلام نے کیونکر سیاسی طور پر ایک کردار حاصل کیا، اور اس منصب کی مناسبت سے اپنی صلاحیتیں بادشاہ کو پیش کیں، پھر یہ غور فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ نے کیونکر اس کو کامیابی بنایا اور اس کو "تمکین" کہا۔

اس نظامِ مصر میں سیاسی کردار حاصل کرنے کے پیچھے یوسف علیہ السلام کے پیشِ نظر محرکات کیا تھے؟ ابن تیمیہ اس کا جواب دیتے ہیں:

وأما سؤال يوسف وقوله "اجعلني على خزائن الأرض" فلأنه كان طريقا إلى أن يدعوهم إلى الله، ويعدل بين الناس، ويرفع عنهم الظلم، ويفعل من الخير مالم يكونوا يفعلوه (مختصر المصرية ص 564)

جہاں تک یوسف علیہ السلام کا عہدہ طلب کرنا اور فرمانا کہ "مجھے زمین کے خزانوں پر مقرر کر دو"، تو وہ اس لیے کہ یہ اس بات کے لیے راستہ تھا کہ آپؑ ان کو اللہ کی طرف بلائیں، نیز انسانوں کے مابین انصاف قائم کریں، ان سے ظلم کو ختم کریں اور خیر کے وہ امور انجام دیں جنہیں وہ لوگ انجام دینے والے نہ تھے۔

یوسف علیہ السلام کے مقاصد کے حوالے سے، ایک اور مقام پر ابن تیمیہؒ کہتے ہیں:

سأل الولاية للمصلحة الدينية (الفتاوى: ج 15 ص 114)

آپؑ نے عہدہ طلب فرمایا دینی مصلحت کے لیے۔

تو پھر اب ہم اصل سوال پر آجاتے ہیں: کوئی آدمی یہاں اگر یہ کہنے لگے کہ مسلمان کے لیے جائز ہے کہ وہ ایک ایسا سیاسی نظام قائم کرے جو شرک پر قائم ہو، اور اگر اُسے پوچھا جائے کہ اس کی دلیل کیا ہے؟ تو وہ کہے: دلیل اس کی یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام نے شرک پر قائم ایک سیاسی نظام کے اندر شرکت کی تھی۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ مسلمان کے لیے جائز ہے کہ وہ

شرک پر قائم ایک نظام کو وجود دے لے! ایسا استدلال کرنے والے کی بابت کیا رائے رکھی جائے گی؟ ظاہر ہے ایسے شخص کا علم سے کوئی تعلق نہ ہوگا اور وہ استدلال کرنے کی قدرت سے کورا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ ان دو باتوں میں ایک بنیادی فرق ہے: ایک ہے مقامِ انشاء، یعنی ایک نظام کو وجود میں لے کر آنا، اور دوسرا ہے مقامِ مشارکہ، یعنی کسی مصلحتِ راجحہ کو دیکھتے ہوئے اس میں کوئی کردار ادا کر آنا۔ پہلا ہے مقامِ اختیار، یعنی جہاں مرضی ہی آپ کی چلتی ہے اور دوسرا ہے مقامِ اضطرار، یعنی جہاں آپ کی بے بسی ہے۔ پہلی ہے حالتِ قدرت اور دوسری ہے حالتِ عجز۔

اب ہم ایک دوسری مثال لیتے ہیں: یہ ہے حبشہ کے نصاریٰ کا سیاسی نظام۔ یہ ایک نصرانی نظام تھا، جس میں نصرانی پاپائیت کا غلبہ تھا۔ پادریوں کو اچھے خاصے اختیارات حاصل تھے، یہاں تک کہ کسی وقت وہاں کے اساقفہ اور پادری ایک بادشاہ کو ہٹا کر اس کی جگہ دوسرے کو بٹھا دیتے تھے، جیسا کہ کتبِ سیرت میں بروایت عائشہ رضی اللہ عنہا و دیگر آتا ہے۔

اب اِس نظام میں اصحمہ نام کا نجاشی نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آتا ہے اور آپؐ کی خدمت میں باقاعدہ مکتوب روانہ کرتا ہے کہ وہ آپ پر ایمان لے آیا ہے۔ اس کے باوجود وہ یہ طاقت نہیں رکھتا کہ اِس حبشی نصرانی نظام کے اندر وہ شریعتِ اسلامیہ کا نفاذ کر دے۔[1] نجاشی اصحمہ اسی پر اکتفاء کرتا رہا کہ وہ اپنے امکان اور طاقت کی حد تک وہاں پر عدل و انصاف قائم کیے رکھے۔ نجاشی نے اپنے مکتوب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے باقاعدہ پوچھا بھی کہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اُس کو حکم دیتے ہیں کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت حاضر ہو جائے، مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کو اُس حبشی نصرانی نظام کی سربراہی چھوڑ دینے کا حکم صادر نہیں فرمایا۔

---

[1] یہاں پر ہمارے بعض اصحاب یہ جواب دیتے ہیں کہ ہجرتِ حبشہ کے وقت ابھی شریعت کے کونسے ایسے احکام نازل ہوئے تھے جو نجاشی کی بابت یہ سوال اٹھایا جائے کہ اُس نے شریعت نافذ کیوں نہ کی؟ تاہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا صلحِ حدیبیہ کے بعد بادشاہوں کو اسلام کی دعوت پر مبنی مکتوب روانہ فرمانا، اور ان وقائع میں نجاشی کا اعلانِ ایمان یہ گنجائش نہیں چھوڑتا کہ احکامِ شریعت نازل نہ ہوئے ہونے کا عذر کیا جائے۔ یقیناً صلح حدیبیہ تک شریعت کا بہت بڑا حصہ نازل ہو چکا تھا۔ (مترجم)

ابن تیمیہؒ کہتے ہیں:

فالنجاشي وأمثاله سعداء في الجنة وإن كانوا لم يلتزموا من شرائع الإسلام ما لا يقدرون على التزامه ، بل كانوا يحكمون بالأحكام التي يمكنهم الحكم بها

(الفتاویٰ ج 19 ص 229)

نجاشی اور اس جیسے لوگ جنت میں خوش و خرم رہنے والے ہیں، اگرچہ انہوں نے شرائع اسلام میں سے اُن احکام کی پابندی نہیں کی جن کی وہ طاقت نہ رکھتے تھے۔ اس کی بجائے یہ صرف اُن احکام کے مطابق حکومت کرتے تھے جن کی رو سے حکومت کرنا ان کے لیے ممکن تھا۔

چنانچہ یہ واقعہ اس بات پر دلیل ہے کہ ایک نصرانی حکومت میں سیاسی انداز کی شرکت کر لینا جائز ہے اگرچہ ایسی شرکت کرنے والا آدمی اکثر احکامِ شریعت کو نافذ کرنے پر نہ بھی قدرت رکھتا ہو، بشرطیکہ وہاں کوئی ایسی راجح مصلحت پائی جائے جو اس بات کا تقاضا کرتی ہو کہ وہاں انصافِ شرعی زیادہ سے زیادہ قائم اور ظلم کو زیادہ سے زیادہ کم کر دیا جائے۔

اب یہاں پر اگر کوئی صاحب یہ نکتہ اٹھائیں کہ ایک عیسائی سیاسی نظام کو وجود میں لانا جائز ہے، کیونکہ نجاشی نے ایک عیسائی سیاسی نظام کے اندر شرکت جاری رکھی تھی اور اس کا یہ فعل شریعت کے مطابق مانا گیا... تو ایسے استدلال کو ہم آخری درجے کی سطحیت کہیں گے؛ کیونکہ ہر شخص اہل علم کے کلام میں ان دونوں باتوں کے مابین فرق کر سکتا ہے کہ مقامِ اِنشاء (ایک چیز کو اساس سے وجود میں لانا) اور ہے۔ اور مقامِ مشارکہ (ایک عمل میں سیاسی نوعیت کا ایک کردار رکھ لینا) جبکہ مصلحتِ راجحہ اس بات کا تقاضا کر رہی ہو، بالکل اور ہے۔

اب ہم ایک تیسری مثال کی طرف چلتے ہیں۔ یہ ہے تاتاری نظام کے تحت قضاء کا عہدہ قبول کرنا۔ ابن تیمیہؒ کہتے ہیں:

وكثيرا ما يتولى الرجل بين المسلمين والتتار قاضياً ، بل وإماماً ، وفي نفسه أمور من العدل يريد أن يعمل بها فلا يمكنه ذلك ، بل هناك من يمنعه ذلك ، ولا يكلف الله نفسا إلا وسعها

(الفتاویٰ ج 19 ص 218)

بسا اوقات آدمی مسلمانوں اور تاتاریوں کے مابین قاضی کے عہدے پر فائز ہو جاتا ہے، بلکہ امام کے عہدے پر فائز ہو جاتا ہے، جبکہ اُس کے جی میں یہ ہے کہ وہ عدل کے بہت سے امور سر انجام دے، لیکن اس کے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا بلکہ اسے اس بات سے روکنے والے وہاں پر ہوتے ہیں، اللہ بھی کسی نفس کو اس کی استطاعت سے بڑھ کر مکلف نہیں کرتا۔

یہاں پھر ہم وہی سوال رکھ لیتے ہیں: کیا خیال ہے اگر آپ کسی کو یہ نکتہ وری کرتے ہوئے

سنیں کہ: مسلمان کے لیے جائز ہے کہ وہ تاتاریوں جیسا مشرکانہ نظام قائم کرے، اس کی دلیل یہ کہ اہل علم نے مسلمانوں اور تاتاریوں کے مابین عہدۂ قضاء قبول کرنے کو جائز کہا ہے۔ کیا ایسا استدلال کرنے والا شخص جاہل نہ کہلائے گا؟ کیونکہ ایک نظام کو وجود میں لانا اور چیز ہے اور ایک چلتے ہوئے نظام میں کسی شرعی مصلحتِ راجحہ کے تحت حصہ لینا بالکل اور چیز۔

یہی معاملہ ایک چوتھی مثال کا رہے گا۔ اور وہ یہ کہ عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ نے بنی امیہ کے بعض مظالم جن پر عمرؒ کو قدرت نہ ہوئی اپنی اُسی حالت پر چھوڑ دیے۔ مفتی دیار مصر امام ابن عبد الحکم (متوفی 214ھ) نے سیرۃِ عمر بن العزیز میں قصر ریاست میں پیش آنے والے بعض امور کو نقل کیا ہے، کہتے ہیں:

> عمر بن عبد العزیزؒ نے منصب سنبھالا تو ان کے بیٹے عبد الملک نے ان سے کہا: ابا جان میں دیکھ رہا ہوں آپ نے ایسے بہت سے امور کو موخر کر چھوڑا ہے جن کی بابت میرا خیال تھا کہ آپ کو دن کی کسی ایک گھڑی کے لیے بھی عہدہ ملے تو آپ ان کا معاملہ نمٹانے میں دیر نہ کریں۔ میری خواہش تھی کہ آپ یہ کام کر گزرتے، اگرچہ اس کی پاداش میں مجھے اور آپ کو ابلتی ہانڈیوں میں کیوں نہ ڈال دیا جاتا۔ عمرؒ بولے: بیٹا تمہیں خدا نے بڑی نیکی دے رکھی ہے۔ مگر تم میں نوجوانوں والی ناپختگی رائے بھی ہے۔ بخدا میں ان کے معاملے میں جو بھی دینی فیصلہ کرتا ہوں ساتھ میں تھوڑا سا دنیا کا معاملہ بھی رکھتا ہوں، جس سے میں ان کے دلوں کو اپنے ساتھ چلا لیتا ہوں، اس اندیشے سے کہ ان کی جانب سے پورا معاملہ ہی چوپٹ ہو جائے، اور وہ میرے بس سے ہی باہر ہو جائے۔ (سیرت عمر بن عبد العزیز ص 57)

ایک دوسرے واقعے میں عمر بن عبد العزیزؒ اور ان کے بیٹے کا مکالمہ یوں نقل ہوا ہے:

> عمر بن عبد العزیزؒ کی حکایت میں آتا ہے کہ ان کے بیٹے عبد الملک نے ان سے کہا: کیا ہو گیا ہے آپ امور کو نافذ کیوں نہیں کرتے۔ بخدا مجھے پروا نہیں کہ حق کے معاملے میں مجھے اور آپ کو ابلتی ہانڈیوں میں پھینک دیا جائے۔ عمر بولے: بیٹا جلد بازی نہ کرو؛ اللہ نے شراب کی قرآن کے اندر صرف مذمت کی اور پھر تیسری بار جا کر اس کو حرام کیا۔ میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ میں ایک ہی بار حق کو لوگوں

پر پورا کا پورا لاد دوں اور وہ اس کو پورا کا پورا متروک ٹھہرا دیں، اور اس سے فتنہ جنم لے لے'' (الموافقات: ج2 ص148)

یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اموی سیاسی نظام میں حصہ لیا[2]، جو کہ زبردستی مسلط ہونے والا نظام تھا۔ امویوں کے اس نظام میں لوگوں کا ناحق خون بھی ہوتا رہا اور ناحق اموال پر بھی تصرف ہوتا رہا۔ اس کے باوجود عمرؒ نے بعض مظالم جوں کے توں چھوڑ دیے اور ان کو ختم نہ کیا، یعنی شریعت کو مکمل طور پر نافذ نہ کیا، بلکہ حسب استطاعت شریعت نافذ کی، جیسا کہ عمر اور آپ کے بیٹے کے مکالمہ سے ظاہر ہے۔

تو کیا یہاں یہ سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ ایک دھونس سے قائم کیا گیا سیاسی نظام کھڑا کرنا جائز ہے اور کوئی اس کی دلیل پوچھے تو کہے کہ کیا عمر بن عبد العزیز نے ایک دھونس اور جبر سے قائم کیے گئے نظام میں شمولیت نہ رکھی تھی؟ بلکہ خلافت کا منصب پالینے کے بعد بھی کیا اس کے بعض مظالم جوں کے توں نہ رہنے دیے تھے؟ کیا یہ استدلال کرنا عقلمندی ہوگی؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔ مقامِ انشاء (ایک نظام کو وجود میں لانا) اور ہے اور مقامِ مشارکہ (مصلحتِ راجحہ کی بنیاد پر اس میں محض شرکت کرلینا) اور ہے۔

ان دونوں باتوں کا فرق اگر اچھی طرح واضح ہوچکا، تو اب ہم اپنے زمانے کی طرف آتے ہیں:
ہم جانتے ہیں کہ ہمارے دور کے عام علمائے اہل سنت[3] نے ڈیموکریٹک نظام پر خلافِ

---

[2] عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کا اموی سیٹ اپ میں شامل ہونا صرف ''خلافت'' کے منصب پر فائز ہونے سے شروع نہیں ہوتا (کہ جب انہوں نے لوگوں کو یہ اختیار تک دے ڈالا کہ اگر وہ چاہیں تو ان کی بیعت نہ کریں)۔ بلکہ عمر بن عبد العزیز کا اقتدار میں آنا اس سے بہت پہلے سے ہے؛ خلیفہ بننے سے پہلے خاصا عرصہ وہ امویوں کے گورنر رہے تھے اور ''حسبِ امکان'' عدل قائم کرکے رہے تھے۔ چنانچہ عمرؓ کا عہدۂ خلافت تک پہنچنا دراصل اُس حسنِ کارکردگی کا نتیجہ تھا جب وہ اس ظالم نظام کے تحت گورنر بن کر رہے اور اپنی اعلیٰ صلاحیتیوں اور اپنے تقویٰ و انصاف کے لیے مشہور اور معروف ہوچکے تھے۔ یہ خلافت کسی 'حجرے' میں بیٹھے شخص کو بہر حال نہیں ملی تھی! (مترجم)

[3] ''عام علمائے اہل سنت'' جزیرۂ عرب کے عرف میں؛ کیونکہ مؤلف جزیرۂ عرب سے ہیں اور جزیرۂ عرب کے لیے لکھ رہے ہیں۔ (مترجم)

شریعت ہونے کا حکم لگا رکھا ہے۔ (ڈیموکریسی اور شریعت کے مابین تصادم اس تصنیف میں آگے چل کر بیان ہوگا)۔ اس بنا پر اس نظام کو وجود میں لانا جائز نہ ہوگا۔ ہاں البتہ جہاں یہ پہلے سے موجود ہے، وہاں یہ علماء اس میں سیاسی نوعیت کی شرکت کو جائز کہتے ہیں بشرطیکہ مصلحتِ راجحہ اس بات کا تقاضا کرے۔ علماء کے ان فتاویٰ کی ہم چند مثالیں دیتے چلیں گے:

أ: ابن سعدیؒ کا موقف:

قصہ شعیب علیہ السلام پر گفتگو کرتے ہوئے، علامہ ابن سعدی (متوفیٰ 1376ھ، تفسیر سعدی کے مؤلف) لکھتے ہیں:

> یہ سماجی رشتے جن سے کام لے کر اسلام اور مسلمانوں سے شر کو دفع کر لیا جائے، ان کو پروان چڑھانے کے لیے کوشش کرنا برا نہیں۔ بلکہ کسی وقت یہ ضروری ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اصلاح حسبِ قدرت و حسبِ امکان ہی مطلوب ہے۔ بنابریں؛ مسلمان اگر کہیں پر کفار کے غلبہ کے تحت ہوں اور وہاں جمہوری اقتدار کی ہی کوئی صورت نکال لیں، جس میں مسلمان بطورِ فرد اور بطورِ قوم اپنے دینی و دنیوی حقوق حاصل کر سکتے ہوں، تو وہ اس سے کہیں بہتر ہوگا کہ وہ ایک ایسی (استعماری) حکومت کے غلام بن کر رہیں جو نہ انہیں ان کے دینی حقوق دینے کی روادار ہو اور نہ دنیوی حقوق، بلکہ وہ ان کا وجود ہی ختم کرنے کے درپے ہو، اور ان کو گھٹیا درجے کے نوکر اور خدمتگار بنا کر رکھنے کی پالیسی پر کاربند ہو۔ ہاں اگر یہ ممکن ہے کہ سارے کا سارا اقتدار ہی مسلمانوں کے ہاتھ میں آجائے اور حکمران ہی خود مسلمان ہوں، پھر تو یہی فرض ہوگا، لیکن اگر اِس درجہ کو پانا ممکن نہیں، تو پھر وہ درجہ پا لینا ہی دین کی رو سے مقدم ہوگا جس میں دین اور دنیا کا (حتی الامکان) تحفظ ہوتا ہو، واللہ اعلم۔ (تفسیر سعدی ص389)

یہاں آپ ابن سعدی رحمۃ اللہ علیہ کے تفقہ کی گہرائی کا اندازہ کرتے ہیں؛ جو صاف طور پر مقامِ اختیار اور مقامِ اضطرار کے مابین فرق کرتے ہیں۔ مسلمان اگر صورتحال پر اختیار رکھتا ہے پھر تو اس پر یہی واجب ہے کہ وہ خالص شرعی نظام قائم کرے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: "ہاں اگر یہ ممکن ہے کہ سارے کا سارا اقتدار ہی مسلمانوں کے ہاتھ میں آجائے اور حکمران ہی خود مسلمان ہوں، پھر تو یہی فرض ہوگا"۔ لیکن جہاں بس نہیں چلتا، وہاں وہ کہتے ہیں: جو اس سے

نچلا درجہ ہے پھر وہی مطلوب ہو جائے گا، اور جو کہ ایک جمہوری حقوق والا نظام ہے (جو ایک ایسی حالت سے بہر حال بہتر ہے جہاں مسلمانوں پر متسلط استعمار ان کو گھٹیا درجے کے نوکر اور اردلی بنا کر رکھتا ہے اور وہ حقوق بھی دینے پر آمادہ نہیں جو ایک جمہوری نظام کے اندر ایک محکوم قوم کو مل جاتے ہیں)۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں ابن سعدی ایک جمہوری نظام کا مسلمانوں کے حق میں جائز ہونا اس بات سے مشروط ٹھہراتے ہیں کہ انہیں ایک ایسی صورتحال درپیش ہے جہاں وہ ایک شرعی نظام قائم کرنے کی قدرت اور اختیار ہی سے محروم ہیں۔ ابن سعدی کی اس گراں قدر عبارت سے یہ بات ماخوذ ہوتی ہے کہ ابن سعدی رحمۃ اللہ علیہ ایک جمہوری نظام کو خلافِ شریعت ہی جانتے ہیں، یہ وجہ ہے کہ وہ اس کے جائز ہونے کو مسلمانوں کے عجز اور اضطرار سے مشروط ٹھہراتے ہیں۔

اب یہاں اگر کوئی شخص کہے کہ: شیخ ابن سعدی رحمۃ اللہ علیہ اس بات کے قائل ہیں کہ ایک اسلامی حکومت کو جمہوری نظام میں بدل دینا جائز ہے، تو ہم کہیں گے یہ شخص مدلس اور فریب کار ہے۔ کیونکہ شیخ ابن سعدی واضح طور پر کہتے ہیں کہ اگر مسلمان طاقت رکھتے ہیں پھر تو اسلامی نظام ہی فرض ہے، ہاں جس وقت یہ ممکن نہیں وہاں جمہوری نظام کی طرف جایا جا سکتا ہے، بشرطیکہ اس کی مصلحت راجح ہو۔ اور یہ عین وہ بات ہے جو اہل علم کرتے آئے ہیں، اور اکثر فقہاء اس بات سے اختلاف نہیں کرتے۔

ب: فتویٰ کمیٹی زیر سرکردگی شیخ ابن باز کا موقف:

سعودی عرب کی لجنۃ دائمۃ للافتاء نے شیخ ابن باز رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 1420ھ) کی سرکردگی میں متعدد فتوے صادر کیے ہیں، سب کے سب بلا استثناء ان دونوں مقامات میں فرق کرتے ہیں: مقامِ اختیار (جہاں آدمی کی مرضی چلتی ہے) اور مقامِ اضطرار (جہاں آدمی کی مرضی نہیں چلتی)۔ نیز یہ سب کے سب فتاویٰ مقامِ انشاء (ایک چیز کو وجود میں لانا) اور مقامِ مشارکہ (اس میں صرف شرکت کر لینا) کے مابین فرق کرتے ہیں، جس وقت شرکت کرنے کے اندر مصلحت راجح ہو۔

آیئے ان میں سے چند فتوے پڑھتے ہیں، ساتھ ساتھ یہ جائزہ لیتے ہیں کہ ان کے اندر کونسے قواعد اختیار کیے گئے ہیں:

پہلا فتویٰ:

سوال: کیا انتخابات میں ووٹ ڈالنا اور بطورِ امیدوار نامزد ہونا جائز ہے؟ معلوم رہے کہ ہمارے ملک میں حکم بغیر ما انزل اللہ کا نظام ہے۔

جواب: مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ امیدوار نامزد ہو تا کہ وہ ایک ایسے نظام کا حصہ بنے جو حکم بما انزل اللہ پر قائم نہیں ہے، ایسی حکومت کا حصہ بنے جو شریعتِ اسلام کے مطابق نہیں چلتی۔ مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ ایسے شخص یا اس جیسے کسی دوسرے کے لیے ووٹ ڈالے جو اس نظام کے اندر کام کریں گے۔ اِلّا یہ کہ نامزد ہونے والا مسلمان یا اُس کو ووٹ ڈالنے والے مسلمان یہ امید رکھتے ہوں کہ اس میں شامل ہو کر وہ اس نظام کو بدل کر شریعت کے تابع کر دیں گے، اور اس بات کو وہ اس نظام پر قابو پانے کا ایک ذریعہ سمجھتے ہوں۔ اس شرط پر کہ اس کے لیے نامزد مسلمان کامیاب ہو جانے کے بعد ایسے کسی عہدے پر کام نہ کرے جو شریعتِ اسلامیہ کے منافی ہو۔

(فتویٰ اللجنۃ الدائمۃ رقم 407:23)

چنانچہ دیکھ لیجئے کس طرح یہ علماء مقامِ انشاء (ایک نظام کو وجود میں لانا) اور مقامِ مشارکہ (ایک پہلے سے پائے گئے نظام میں سیاسی شرکت کرنا) کے مابین فرق کرتے ہیں، جبکہ ایسا کرنا راجح مصلحت کا تقاضا ہو۔ اور یہ عین وہ بات ہے جو ایک غیر شرعی سیاسی نظام کی بابت شروع دن سے فقہائے اسلام بیان کرتے آئے ہیں۔

ایک دوسرے فتویٰ میں ایک سیکولر سیاسی نظام والے ملک کے اندر اسلامی پارٹیاں تشکیل دینے کے متعلق سوال کیا گیا:

سوال: کیا یہ جائز ہے کہ ایک سیکولر ملک کے اندر اسلامی پارٹیاں قائم کرلی جائیں اور یہ پارٹیاں قانونی تقاضے پورے کرتے ہوئے باقاعدہ انداز میں کام کریں تاہم ان پارٹیوں کی غرض و غایت کچھ اور ہو اور وہ یہ کہ درحقیقت وہ اسلامی دعوت کا کام کررہی ہوں؟

جواب: وہ مسلمان جو کسی کافر ملک میں رہائش کی آزمائش میں مبتلا ہیں، ان کے لیے جائز ہے کہ وہ رابطۂ باہمی میں آئیں، آپس میں متعاون ہوں، خواہ وہ اسلامی پارٹیوں کے زیر عنوان ہو یا اسلامی انجمنوں کے زیر عنوان؛ اس لیے کہ اس میں تعاون علی البر والتقویٰ کی ایک صورت ہے (فتوی اللجنۃ الدائمۃ رقم 408:23)

چنانچہ یہاں اہل علم ایک سیکولر سیاسی نظام کو وجود میں لانے کی ممانعت ہی کرتے ہیں۔ لیکن ایک ایسا نظام جو پہلے سے قائم ہے اس میں سیاسی کردار ادا کرنے کی اجازت دیتے ہیں اگر راجح مصلحت کا یہی تقاضا ہو۔ اب اگر کوئی آدمی آئے اور کہے کہ فتویٰ کمیٹی ایک سیکولر نظام قائم کرنے کو جائز قرار دیتی ہے اور دلیل اس کی یہ کہ اس نے ایک سیکولر نظام میں حصہ لینے کے جواز کا فتویٰ دیا ہے... تو ایسے آدمی کی سمجھ بوجھ کے بارے میں عقلاء کیا رائے رکھیں گے؟

اس سلسلہ میں ایک نہایت خصوصی فتویٰ بھی ہمیں دستیاب ہے، جس سے پوری طرح واضح ہے کہ ان مسائل میں علماء "مصلحتِ راجحہ کا اعتبار" کرنے کی اپروچ کے معاملات کو لیتے ہیں، جس کے تحت وہ ایک نظام کے اندر سیاسی انداز کی شرکت کے دائرے کو وسیع بھی کر دیتے ہیں۔ فتویٰ میں سوال اور جواب یوں ہے:

سوال: بعض لوگ ہیں تو مسلمان لیکن وہ سیاسی پارٹیوں کی ممبرشپ لےلیتے ہیں۔ یہ پارٹیاں یا تو روس نواز ہوتی ہیں یا امریکہ نواز۔ یہ پارٹیاں خاصی زیادہ اور متنوع ہیں۔ پروگریسو سوشلسٹ پارٹی ہے انڈی پنڈنٹ پارٹی ہے نیشنل پارٹی ہے یوتھ انڈی پنڈنٹ پارٹی ہے۔ ڈیموکریٹک پارٹی ہے۔ ان پارٹیوں کی بابت اسلام کا کیا موقف ہے۔ اور اس شخص کا کیا حکم ہے جو ان پارٹیوں کا ممبر بن جائے؟ کیا وہ مسلمان رہ جاتا ہے؟

جواب: وہ شخص جو اسلامی بصیرت رکھتا ہے، ایمان میں قوی ہے، نظریاتی لحاظ سے اس درجہ پر ہے کہ وہ کسی نظریے کی چکاچوند سے بہک نہیں جائے گا، معاملہ فہم اور عاقبت اندیش ہے، زبان کی فصاحت سے مالامال ہے، اور ایسی صلاحیتوں کا مالک ہے کہ وہ ایک پارٹی کے رخ پر اثر انداز ہو سکے، اور اس کو اسلام کی جانب لے کر آ سکے، تو اس کے لیے

جائز ہے کہ وہ ان پارٹیوں کے ساتھ گھلے ملے، یا ان پارٹیوں میں ایسے عناصر کے ساتھ گھلے ملے جن کی بابت اُسے امید ہے کہ وہ حق کو قبول کرنے والے ہیں۔ بہت امکان ہے ایسے آدمی کے ذریعے اللہ تعالیٰ نفع بخش صورت پیدا فرمادے، اور اس کے ہاتھ پر کچھ لوگوں کو راہِ راست پر لے آئے اور وہ منحرف سیاسی پٹریوں کو چھوڑ کر اسلام کی عادلانہ سیاست کی جانب آجائیں، جس سے امت کی شیرازہ بندی ہو۔ تاہم اس عمل کے دوران اس کے لیے یہ جائز نہ ہوگا کہ وہ اُن (پارٹیوں) کے منحرف اصولوں کا پابند ہو جائے۔ ہاں وہ شخص جو اِس درجہ کا ایمان نہیں رکھتا، نظریاتی طور پر اس کو یہ ناقابلِ تسخیر حیثیت حاصل نہیں، بلکہ اس کے بارے میں اندیشہ ہے کہ وہ وہاں پر اثرانداز ہونے کی بجائے اثر قبول کر آئے گا، تو ایسے شخص پر واجب ہے کہ وہ ان پارٹیوں سے کنارہ کش ہی رہے، یہی اس کے حق میں فتنہ سے دور رہنا ہے، اور یہی اس کے حق میں ایمان کا تحفظ ہے کہ مبادا اس کی دینی حالت بھی وہی ہو جائے جو اُن لوگوں (پارٹیوں) کی ہے اور یہ بھی اُسی فساد اور انحراف میں مبتلا ہو جائے جس میں وہ (پارٹیاں) مبتلا ہیں۔ اور توفیق دینے والا اللہ کے سوا کوئی نہیں۔

(فتویٰ اللجنۃ الدائمۃ: رقم 385:12)

سبحان اللہ! اب ذرا یہاں آپ غور کرلیں، جن پارٹیوں کے بارے میں سوال کیا گیا ان کے کتنے کتنے صریح اور ناگفتہ بہ اوصاف مذکور ہوئے۔ میں نے عمداً سوال میں مذکور یہ کلمات من وعن نقل کیے، تا کہ جواب میں ذکر ہونے والی اُس ''گنجائش'' کا اندازہ ہو جائے جو ایک سیاسی عمل میں علمائے اہل سنت کے ہاں دی جاتی ہے۔ ظاہر ہے، یہ سب کی سب پارٹیاں صاف صاف اسلام کے منافی ہیں۔ اس کے باوجود فتویٰ کمیٹی کے علماء نے ان دو حیثیتوں کا فرق کیا ہے: یعنی ایک وہ حیثیت جس میں آپ ایسی ایک پارٹی کو وجود میں لاتے ہیں، اور دوسری وہ حیثیت جس میں آپ ایسی ایک پارٹی میں سیاسی انداز کی شرکت کرتے ہیں؛ ایسا کرنے کی کسی مصلحت کو راجح پاتے ہوئے۔

اب اگر کوئی صاحب اٹھیں اور کہیں کہ فتویٰ کمیٹی نے تو ایسی سب پارٹیاں بنانا جائز کر دیا جو اشتراکی ہوں، بائیں بازو کی ہوں، ڈیموکریٹک ہوں یا لبرل ہوں؛ کیونکہ کمیٹی نے اپنے ایک

فتویٰ میں ایسی پارٹیوں میں شرکت بشرط مصلحتِ راجحہ کو جائز کہہ دیا ہے... تو یہ اِن فتاویٰ کو پڑھنے اور سمجھنے کا ایک غیر صحتمند اسلوب ہو گا۔

اوپر کے یہ تینوں فتوے لجنۃ دائمہ نے شیخ ابن باز رحمۃ اللہ علیہ کی سرکردگی میں صادر کیے۔ ایک فتویٰ میرے پاس ابھی اور ہے جو صرف شیخ کا ہے، یہ فتویٰ کمیٹی کے فورَم سے شائع نہیں ہوا۔ شیخ مرحوم نے یہ فتویٰ کسی زمانے میں مجلۃ لواء الاسلام سے شائع کرایا تھا۔ مجلہ کا یہ شمارہ تو تلاشِ بسیار کے باوجود مجھے نہیں مل پا رہا، تاہم شیخ کا یہی فتویٰ مجھے شیخ مناع القطان رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 1420ھ) کے ایک مقالہ بہ عنوان "معوقات تطبيق الشريعة" میں منقول ہوا مل گیا، جب تک مجھے وہ مجلہ دستیاب نہیں ہو جاتا تب تک میں شیخ مناع القطان کے الفاظ کے ساتھ ہی شیخ ابن باز کا یہ فتویٰ نقل کرتا ہوں:

> ہمارے شیخ فضیلت مآب، عالمِ زاہد شیخ عبد العزیز بن باز سے پوچھا گیا کہ اسمبلی کی رکنیت کے لیے نامزد ہونے کا کیا حکم ہے، نیز ووٹ بنوانے کا اسلام میں کیا حکم ہے جبکہ آدمی کی نیت یہ ہے کہ وہ اسلام کے کسی داعی کو منتخب کرے گا اور دینداروں کو اسمبلی میں پہنچانے کی کوشش کرے گا۔ فضیلت مآب شیخ نے اس کا جواب یوں دیا تھا:
>
> "نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے إنما الأعمال بالنيات۔ اس بنا پر اسمبلی میں جانا باعثِ حرج نہیں بشرطیکہ اس سے مقصود حق کے لیے حمایت پیدا کرنا اور باطل کی موافقت اختیار نہ کرنا ہو، اس وجہ سے کہ ایسا کرنے میں حق کو نصرت ملتی ہے، اور داعیانِ دین کو تائید میسر آتی ہے۔ اسی طرح ووٹ بنوانے میں بھی کوئی حرج نہیں جبکہ اس سے مقصود صالح داعیوں کو منتخب کرنا اور حق اور اہل حق کی تائید کرنا۔ اور اللہ ہی توفیق دینے والا ہے"۔ منقول از مجلۃ لواء الاسلام شمارہ 3 سن 1409ھ 1989ء۔

معوقات تطبيق الشريعة، ص 166

شیخ ابن باز (اللہ ان کی قبر کو بقعۂ رحمت بنائے) کے اور بھی کئی فتاویٰ ہیں جن میں غیر شرعی سیاسی نظاموں کے اندر شرکت کرنا جائز قرار دیا گیا جبکہ یہ مصلحتِ راجحہ کا تقاضا ہو۔ یہ فتاویٰ بھی انہی فقہی قاعدوں پر انحصار کرتے ہیں جو پیچھے مذکور فتاویٰ کے اندر بیان ہوئے یعنی حیثیتِ اِنشاء اور حیثیتِ مشارکہ کے مابین فرق کرنا اور حالتِ اختیار اور حالتِ اضطرار کے حکم کو الگ الگ رکھنا۔

ج: فقیہِ عصر شیخ ابن عثیمین رحمۃ اللہ علیہ کا موقف:

میں نے نوٹ کیا ہے، وقت کے خلافِ شریعت نظاموں کے اندر سیاسی طور پر کردار رکھنے اور اثرانداز ہونے کے معاملہ میں سب سے زیادہ حوصلہ افزائی شیخ ابن عثیمین رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 1421ھ) کے ہاں پائی جاتی ہے۔ شیخ کے متعدد فتاویٰ کو دیکھنے سے یہی بات محسوس ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک فتویٰ شیخ اور ان کے طلبہ کے مابین گفتگو پر مبنی ہے جو ربیع الاول 1420ھ میں واقع ہوئی۔ قاری سے میری درخواست ہوگی کہ وہ ذرا دِقت کے ساتھ غور کرے کہ سوال کس قسم کی صورتحال کی بابت کیا گیا ہے، جس پر شیخ پورے وثوق کے ساتھ شرکت کے جواز کا فتویٰ دے رہے ہیں۔ بلکہ یہ بھی دیکھنے کی چیز ہے کہ شیخ اس کو جواز تک ہی نہیں رہنے دیتے بلکہ وجوب تک لے جاتے ہیں۔ اقتباس کی طوالت پر میں پیشگی معذرت خواہ ہوں:

> سوال: جنابِ شیخ! کویت کے حالیہ انتخابات کی بابت کیا شرعی حکم ہے؟ واضح رہے کہ وہ لوگ جو اب تک ان میں شامل ہوتے رہے ہیں ان کی اکثریت اپنے دین کے معاملہ میں فتنوں کا شکار ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں ضمنی انتخابات کے اندر شرکت کا کیا حکم ہے؟

> جواب: میں سمجھتا ہوں ان میں شریک ہونا واجب ہے۔ لازم ہے کہ اس کے لیے ہم ایسے لوگوں کی ذمہ داری لگائیں جن میں ہم خیر پاتے ہیں۔ کیونکہ اگر اہل خیر سستی دکھانے لگے تو پھر ان کی جگہ لینے کے لیے کون آگے آئے گا؟ اہل شر! کوئی اگر یہ کہے کہ ہمیں بس ایک ہی (اچھا) آدمی ملا ہے، باقی پوری اسمبلی تو اور طرح کے لوگوں سے بھری ہوئی ہے، تو ہم کہیں گے: یہ ایک بھی برا نہیں، اسی ایک میں اللہ اگر برکت ڈال دے، اور یہ اکیلا یہاں پر حق کی زبان بولتا رہے تو اس کی بھی کچھ نہ کچھ تاثیر تو لازماً ہوگی۔ **مگر ہمارا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم خدا کے ساتھ سچے نہیں ہیں۔** ہم مادی 'ریکوائرمنٹس' پر تو خوب خوب توجہ دیتے ہیں، لیکن اللہ کی بات ڈنکے کی چوٹ بیان کرنے کے وقت بھیگی بلی بن جاتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کی بابت آپ کیا کہیں گے جب فرعون آپؑ کو کہتا ہے کہ وہ تمام جادوگروں کے مقابلے پر کھڑے ہو کر دکھائیں۔ موسیٰ علیہ السلام نہ صرف چیلنج قبول کرتے ہیں بلکہ اس کے لیے جو وقت مقرر کرتے ہیں وہ

دن چڑھے کا وقت ہے اور وہ بھی اُن کے قومی جشن کا دن۔ اندازہ کر لیجئے، جشن کا دن، یعنی اُن کی عید کا دن، اور دن کی وہ گھڑی جب پوری خلقت اکٹھی ہو جاتی ہو۔ کھلے میدان کے اندر۔ یہاں لوگوں کے ٹھٹھ لگ جاتے ہیں۔ اور موسیٰ علیہ السلام کیسی للکار کے ساتھ اُن سب کو مخاطب کر کے کہتے ہیں: وَيۡلَكُمۡ لَا تَفۡتَرُوا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسۡحِتَكُمۡ بِعَذَابٍ وَقَدۡ خَابَ مَنِ افۡتَرٰى "شامت کے مارو! نہ جھوٹ گھڑو اللہ پر، ورنہ وہ عذاب سے تم کو فنا کر ڈالے گا، وہ نامراد ہے جو خدا پر جھوٹ گھڑے"۔ ایک مختصر سی بات جو پورے مجمعے پر بم بن کر گری۔ ایسی وثوق کی بات کہ وہ اندر سے ہل کر رہ گئے۔ اس سے اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ فَتَنَازَعُوا أَمۡرَهُمۡ بَيۡنَهُمۡ یعنی یہاں ان کے مابین جھگڑا پھوٹ کھڑا ہوا۔ فَتَنَازَعُوا میں فَ ترتیب کا فائدہ دیتی ہے، نیز تعقیب اور سببیت کا فائدہ دیتی ہے۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام نے یہ ایک ایسی بات کہی کہ ان کے مابین پھوٹ پڑ گئی۔ (قرآن میں جگہ جگہ تنازع یعنی پھوٹ پڑنے کو فشل یعنی بزدلی سے جوڑا گیا ہے) یعنی ان کے دل کھوکھلے کر ڈالے۔ اندازہ کر لیں یہ ایک ہی تو شخص ہے جو کلمۂ حق کو اس زور سے میدان میں لے آیا ہے کہ سامنے پوری ایک قوم ہے اور قوم بھی ایسی جس کا سربراہ تاریخ کا سب سے سرکش انسان ہے، مگر حق کی اِس ایک للکار کے آگے پوری قوم کی گھگی بندھ گئی ہے! تو میں کہتا ہوں فرض کریں پارلیمنٹ میں اہل حق کی ایک تھوڑی سی ہی تعداد پہنچ پاتی ہے، یہ بھی بہت ہے، مگر ضروری یہ ہے کہ یہ تھوڑے سے لوگ خدا کے وفادار ہو کر دکھائیں۔ خدا کے ساتھ اپنا سچا ہونا ثابت کریں۔ اب آپ کا یہ کہنا کہ پارلیمنٹ میں جانا جائز نہیں، فاسقوں کی مجلس میں شریک ہونا صحیح نہیں، ان کے ساتھ بیٹھنا درست نہیں... تو کیا ہم نے یہ کہا ہے کہ ہم اُن کی ہاں میں ہاں ملانے کے لیے ان کے پارلیمنٹ میں بیٹھیں گے۔ ہم وہاں بیٹھیں گے وہاں پر حق کی بات اٹھانے کے لیے۔ ہمارے اہل علم میں سے بعض بھائیوں کا کہنا ہے کہ اس میں شرکت جائز نہیں اس لیے کہ یہ جو سیدھی راہ پر چلنے والا شخص ہے اس کو وہاں ایک منحرف شخص کی صحبت میں بیٹھنا ہو گا۔ میں کہتا ہوں یہ سیدھی راہ پر چلنے والا آدمی اُس منحرف شخص کی صحبت میں بیٹھے گا، خود منحرف ہونے کے لیے یا اُس کو سیدھا کرنے کے لیے؟ سیدھا ٹیڑھے کو سیدھا کرنے کے لیے ہے یا ٹیڑھا سیدھے کو ٹیڑھا کرنے کے لیے؟! سیدھے کو چاہئیے کہ وہ ٹیڑھے کو سیدھا کرے اِس بار نہیں تو اگلی بار، استقامت اختیار

کر کے رہے، ڈٹ کر رہے۔

سوال: اچھا تو بائی الیکشنز؟ جنابِ شیخ؟

جواب: سب ایک ہی ہے۔ ایک ہی حکم ہے ان کا۔ جس شخص میں خیر پاؤ اس کو نامزد کرو، اور اللہ پر بھروسہ کرو۔ (لقاء الباب المفتوح: ل211)

شیخ ابن عثیمین رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فتویٰ صرف کویتی ڈیموکریسی تک نہیں رہا بلکہ امریکی ڈیموکریسی کے بارے میں بھی ان کا یہی فتویٰ رہا۔ ڈاکٹر احمد القاضی نے شیخ کے ساتھ اپنے سوال جواب مدون کیے ہیں اپنی مشہور تالیف "ثمرات التدوین" میں، جس میں بیان ہوا:

میں نے شیخ رحمۃ اللہ علیہ سے امریکہ میں مقیم مسلمانوں کی بابت دریافت کیا: کیا یہ ان انتخابات میں شرکت کریں جو امریکہ میں منعقد ہوتے ہیں، کسی ایسے امیدوار کو جیت دلوانے کے لیے جو مسلم مفادات کی حمایت کرے گا۔ شیخ نے کسی تردد کے بغیر موافقت میں جواب دیا۔ (ثمرات التدوین: م 593)

تو یہاں پر... اگر کوئی شخص یہ کہے کہ سبحان اللہ شیخ ابن عثیمینؒ تو جمہوریت قائم کرنے کو جائز کہتے ہیں خواہ وہ امریکی سسٹم پر ہو خواہ کویتی سسٹم پر، کیونکہ انہوں نے اس میں شرکت کے جواز کا فتویٰ دے ڈالا ہے... تو ایسے شخص کی بات جواب دینے کے قابل نہیں۔ کیونکہ عقلاء مقامِ اختیار اور مقامِ اضطرار کے مابین فرق کرتے ہیں۔ مقامِ انشاء کو مقامِ مشارکہ سے علیحدہ کرتے ہیں، یعنی ایک نظام کو وجود میں لانا اور چیز ہے اور ایک پہلے سے چلے آتے نظام میں مصلحتِ راجحہ کی بنا پر سیاسی نوعیت کی شرکت کرنا اور چیز۔

اب باوجود اس کے کہ ان دو باتوں کا فرق اس قدر واضح ہے... پھر بھی میں دیکھتا ہوں کہ اس موضوع پر بحث کرنے والے اکثر لوگ یہاں خلط پیدا کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ بعض علمائے توحید کے اُن فتاویٰ کو بنیاد بنا کر جن میں وہ کسی حالتِ اضطرار و عجز میں ایک غیر شرعی نظام میں سیاسی شرکت کو جائز قرار دیتے ہیں، یوں استنباط کرنا شروع کر دیتے ہیں گویا اس سے ایک غیر شرعی نظام کو ابتداء سے وجود میں لانا ہی جائز ہو گیا ہے، یعنی حالتِ اختیار و اقتدار میں بھی اس غیر شرعی نظام کو درست ثابت کرنے چل دیتے ہیں!

بہر حال... یہ ہے قاعدہ عامہ جو سیاسۃ شرعیہ کے اس موضوع سے متعلق ہے۔ یعنی مقامِ

انشاء اور مقامِ مشارکہ کے مابین فرق کرنا۔ مقامِ اختیار و اقتدار کے مابین اور مقامِ اضطرار کے مابین تمیز کرنا۔

اب یہاں وہ سوال، جو بعض لوگ اس موضوع پر اکثر اٹھاتے ہیں:

جو شخص ایک غیر شرعی نظام کے اندر سیاسی شرکت کرے گا، وہاں وہ جن شرعی امور کو ترک کرے گا اور ان پر عمل نہیں کرے گا، کیا وہ اس پر گناہگار ہو گا؟

اس سوال کا جواب ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "السياسة الشرعية" کے آخر میں دے رکھا ہے:

فمن وُلِيِّ ولاية يقصد بها طاعة الله ، وإقامة ما يمكنه من دينه ومصالح المسلمين ، وأقام فيها ما يمكنه من الواجبات ، واجتناب ما يمكنه من المحرمات ؛ لا يؤاخذ بما يعجز عنه ، فإن تولية الأبرار خير للأمة من تولية الفجار ، ومن كان عاجزا عن إقامة الدين بالسلطان والجهاد ، ففعل ما يقدر عليه ، من النصيحة بقلبه ، والدعاء للأمة ، ومحبة الخير ، وفعل ما يقدر عليه من الخير ؛ لم يكلف ما يعجز عنه

(السياسة الشرعية ص 133)

پس جو شخص کسی ایسے عہدہ پر فائز ہو، جس کے ذریعے اس کا اپنا مقصد یہ ہے کہ وہ خدا کی اطاعت انجام دے گا اور جتنا اُس کے بس میں ہوا اتنا وہ خدا کے دین کی اقامت اور مسلمانوں کے مصالح کو قائم کرے گا، اور خدا کی حرام کردہ اشیاء سے وہ جتنا بچ سکے اتنا بچے گا، تو ایسا شخص اُن معاملات میں قابل مواخذہ نہ ہو گا جو اس کے بس سے باہر ہیں۔ کیونکہ نیکوکاروں کو عہدوں پر فائز کروانا امت کے حق میں اس سے بہتر ہے کہ ان عہدوں پر بدکاروں کو رکھا جائے۔ جو شخص اپنے اقتدار اور جہاد کے دوران دین کی اقامت سے عاجز رہا اور بس اُنہی اشیاء کی انجام دہی تک محدود رہا جو اس کی مقدرت میں ہیں، مانند دل سے مسلمانوں کے لیے مخلص رہنا، امت کے لیے دعا گو رہنا، خیر کے لیے دل میں تڑپ رکھنا، اور خیر کے جتنے امور انجام دے سکتا ہو ان کو انجام دیتے رہنا... تو ایسا شخص اُن اشیاء کا مکلف ہی نہیں ہے جن کو انجام دینے سے وہ عاجز ہے۔

كتاب "مفاتيح السياسة الشرعية"، مؤلفه الشيخ إبراهيم السكران۔

فصل: "النظام السياسى غير المشروع: الإنشاء والمشاركة"۔

http://majles.alukah.net/t93622/

http://www.saaid.net/book/open.php?cat=83&book=9129